(۲)

انقلابِ افغانستان ہمارے بالکل قریب واقع ہوا ہے، مگر خبروں اور معلومات کے لحاظ سے دیکھیں تو جیسے ہزاروں میل دور کا قصہ ہے۔ خبریں، بیانات، اعلانات، تصویریں اور رپورٹیں برابر چلی آرہی ہیں، مگر اب تک نہ تو تمام جزوی تفاصیل کے بارے میں تیقن سے صحت و عدم صحت کا حکم لگایا جا سکتا ہے، نہ داستانِ انقلاب کی پوری کڑیاں نگاہوں کے سامنے ہیں، نہ یہی اندازہ ہے کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔ ان وجوہ سے پوری طرح تبصرہ کرنے کا موقع ابھی نہیں آیا۔

صرف دو تین سبق آموز پہلوؤں کو اجمالاً پیش کیا جا رہا ہے۔

۱۔ ایک ایسا مسلمان ملک جس کی بھاری اکثریت میں اسلام سے اعتقادی، جذباتی اور روایاتی وابستگی باقی تھی۔ اس کا بہترین سامانِ تحفظ اسلام ہی ہو سکتا تھا۔ مگر حکمرانوں نے مسلمان ہونے کے باوجود اسلام کو جامد مذہبیت کی شکل دے کر مسجدوں میں دھکیل دیا تھا۔ اجتماعی زندگی سے اس کا ذرا سا تعلق تھا بھی تو وہ چند پرائیویٹ سماجی تقاریب کی حد تک تھا۔ اس کی حکمتِ حیات، اس کے سیاسی و معاشی اصولوں اور اس کے تہذیبی تقاضوں کو بے جان اور رسم کر دیا گیا تھا۔ اس کی تحریکی انقلابی روح سلب کر لی گئی تھی۔ نظامِ حکومت اسلام سے آزاد تھا، قانون و تعزیرات کا ڈھانچہ اس سے آزاد تھا۔ معاش اور معاشرت اور تہذیب کی نشوونما اس سے آزاد تھی، تعلیم اور قومی مالیات اور دفاع کے دائرے اس سے آزاد تھے۔ ایسے حالات میں اسلام جیسی عظیم قوت ایک مسلمان قوم کو تاریخی آفات سے تحفظ کیسے دے سکتی تھی۔

افغانستان میں اگر اسلام تحریکی شان کے ساتھ کارفرما ہوتا، لوگ شعوری ایمان سے آراستہ ہوتے، افغانستان سے روشنی کی کرنیں پھیل کر باہر کے اسلامی اور غیر مسلم ممالک میں پہنچ رہی ہوتیں۔ باہر سے مسلم علماء اور غیر مسلم محققین اس سرچشمۂ حکمت سے استفادہ کے لیے آ جا رہے ہوتے، زندگی کے شعبوں کی اٹھان احکامِ قرآن اور سنتِ رسولؐ کی اساس پر ہو رہی ہوتی تو کوئی غیر اسلامی نظریاتی قوت اپنے لیے آلۂ کار حاصل نہ کر سکتی۔ کہیں سے بھی آئے ہوئے ماہرینِ ایمان و اخلاق کے قلعے میں نقب نہ لگا سکتے۔ مگر اسلام کے ساتھ جو سلوک عرصۂ دراز سے بادشاہت نے روا رکھا تھا۔ اس کے انتقام کا سب سے پہلا نشانہ وہی بنی اور اس کے ساتھ وہ پوری قوم بھی ایک خوفناک آزمائش سے دوچار ہو گئی جو سالہا سال سے غیر اسلامی بادشاہت کے آگے سرافگندہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چلی آرہی تھی۔ اور اُسے برطرف کرنے کے لیے اس کے پاس قربانیوں کی کوئی تاریخ نہ تھی۔

اس پہلو سے ایک اہم سبق دُنیا بھر کی مسلم اقوام اور اُن کی حکومتوں کے لیے موجود ہے، اور یہ سبق ہم پاکستانیوں کے لیے خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔ ہم بھی عرصہ دراز سے اسلام کے ساتھ کھیل تماشا کرتے چلے آ رہے ہیں اور اس کا حق ادا کرنے پر تیار نہیں ہیں۔ یہ عظیم قوت جو ہزار آفات سے ہمیں بچا سکتی ہے اُسے ہم نے اس قابل بننے ہی نہیں دیا کہ وہ ہمارے لیے فولادی قلعہ ہو۔ اب بھی تلافی کا وقت ہے اور بہت تھوڑا وقت ہے۔

اگر ہم اپنا تحفظ چاہتے ہیں تو شعوری ایمان کے ساتھ تحریک اسلامی کو اُبھاریں۔ اور اس کے زور سے جلد از جلد اسلامی نظام عدل و رحمت کو برپا کریں۔ ورنہ محض سیاسی چالوں اور سفارتی حیلوں حوالوں اور بڑی قوتوں کے گھٹنے چھونے سے قضا نہیں ٹل سکتی۔

۲۔ دوسرا سبق یہ ہے کہ اسلام سے ہٹ کر انسانوں کے ایجاد کردہ نظاموں اور تہذیبوں میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں جو بنیادی طور پر تعلیم و تلقین سے اپنا راستہ بناتے۔ بخلاف اس کے مکر و سازش اور جبر و بہیمیت ہی ان کا طریق کار رہے۔ باطل نظریوں اور نظاموں کا یہی نشان ہے۔ مغربی مادہ پرستی ہم پر ٹھونسی گئی تو اس امپریلزم کے ذریعے جس نے مزاحمت کرنے والی واحد مسلم قوم کے خون کی ندیاں بہا دیں۔ اب جن مسلم ممالک میں اشتراکیت کے تجربے ہوئے ہیں۔ ان میں بھی بڑا خون خرابہ اور بڑا بے رحمانہ تشدد ہوتا رہا ہے۔ یہی حال انقلاب افغانستان کا ہے۔ نام تو جمہور کا لیا جا رہا ہے، جیسے کہ چند مہینوں اور ہفتوں سے جمہور کسی تبدیلی کا مطالبہ کر رہے تھے اور کوئی تحریک چلا رہے تھے۔ اور اب اُن کی مساعی برگ و بار لائی ہیں؎1۔

فوج کا ایک دھڑا اُٹھتا ہے (ساری فوج بھی یکسو نہ تھی) اور بے شمار افراد؎2 گولیوں کا نشانہ بن جاتے ہیں

؎1 اس کی مثال ہمارے یہاں کی تحریک ۱۹۷۷ء ہے جس میں شہر شہر، قریہ قریہ عوام سڑکوں پر نکل کھڑے ہوتے۔ یہ بات خاص طور سے نوٹ کرنے کی ہے کہ اتنی بڑی تحریک کے لاکھوں افراد نے ظلم کو شکست دینے کے لیے ظلم سہنے کا طریقہ اختیار کیا۔ خود ظلم اور تخریب اور تباہ کاری کی راہ اختیار نہ کی۔ یہ اس وجہ سے کہ تحریک نظام مصطفیٰؐ کے نعرے سے چلی تھی۔ اسلامی قوت کا راستہ ظلم نہیں صبر ہے۔

؎2 نور محمد ترہکی نے کل کی پریس کانفرنس میں کہا ہے کہ یہ تعداد صرف ستر ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شاہی خاندان کے معاملے میں بھی نوبت یہاں تک پہنچی کہ عورتوں اور بچوں کو بھی نہیں بخشا گیا۔ صدر داؤد کی لاش کو گھسیٹے جانے کی خبر بھی آئی ہے۔ جانیں بچانے کے لیے چھپ جانے والے جن لوگوں کو بذریعہ اعلان انقلابی کونسل کے سامنے پیش ہونے کے لیے کہا گیا تھا، اُن کی ایک تعداد واپس آئی تو کسی تحقیقاتی کارروائی کے بغیر گولیوں سے اُڑا دیا گیا۔ انسانوں میں شرف انسانیت کا جو جوہر رکھا گیا ہے، وہ بھی کام نہ کرسکا۔

اور ساری دُنیا میں یہی ہو رہا ہے، ویت نام اور کمبوڈیا کی جنگ میں، اسرائیل میں (شروع سے اب تک) بھارت میں (فسادات کی صورت میں) قبرص میں (چند سال قبل کے واقعات) برما میں (مسلمانوں کے خلاف) غرض جدھر بھی دیکھیے، بالکل حیوانات کی طرح ظالمانہ کارروائیاں ہوتی ہیں۔ بہ اس وجہ سے کہ غیر اسلامی نظریات و تحریکات نے انسانوں کو ان روحانی و اخلاقی خوبیوں سے خالی کر دیا ہے۔ جن سے جوہر انسانیت تشکیل پاتا ہے۔ مادہ پرستانہ ذہن کے ساتھ جنگ کرنے والوں اور انقلاب لانے والوں کی اخلاقی سطح ویسی ہی ہوگئی ہے جیسی ہائی جیکروں، اکابر کو اغوا کر کے یرغمال بنانے والی تنظیموں اور تخریب کاروں کی ہوتی ہے۔

اُٹھا کر دیکھیے تاریخ کہ عیسائی فاتح بن کر بیت المقدس میں داخل ہوتے ہیں تو مسلمانوں پر کیا گزرتی ہے۔ اور اسی بیت المقدس میں سلطان صلاح الدین ایوبی فاتح بن کر داخل ہوتا ہے تو کیسا سلوک کرتا ہے عیسائی آبادی کے ساتھ۔ معلوم ہوا کہ جہاں اسلام کارفرما ہوتا ہے وہاں انسانی شرف کام کرتا ہے۔ اور جہاں کوئی دوسرا نظریہ اثر انداز ہوتا ہے وہاں شرفِ انسانیت کا فقدان ہوتا ہے۔

بہیمانہ مظالم کا یہ سلسلہ ابھی جاری ہے، کیونکہ انقلابی حکومت کے سربراہ نور محمد ترکی نے اعلان کیا ہے کہ عوام کو چاہیے کہ وہ سابق حکومت اور نظام کے حامیوں کو گرفتار کرائیں۔ جوں جوں یہ لوگ گرفتار ہوں گے، ظلم کی چکی گھمر گھمر چلتی رہے گی۔ ان کارروائیوں کے اندر سے نہ جانے کس طرح اسلام برآمد ہو جائے گا، یا جمہوریت نمودار ہو جائے گی۔

سبق یہ ہے کہ مکر و سازش اور ظلم و بہیمیت کی راہ سے آیا ہوا کوئی بھی انقلاب انسانیت کو فلاح نہیں دے سکتا۔

۳۔ یہ بھی بڑی پیچیدہ بات ہے کہ جس حکومت کے تمام کے تمام عمائد کمیونسٹ ہوں، اس کا کمیونسٹ سربراہ یہ پالیسی بیان کرتا ہے کہ انقلابی حکومت، اسلام، جمہوریت اور فرد کی آزادی کے لیے کام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرنا چاہتی ہے[1]۔ اغلباً مسلمان ممالک میں کام کرنے کے لیے اب یہی گائیڈ لائن اُوپر سے دی گئی ہے کہ جیسا دیس ویسا بھیس کے اصول پر انقلاب کے قامت پر کوئی بھی مناسب جامہ فٹ کر لیا جائے۔

بہر حال یہ ایک تضاد ہے۔ کوشش یہ کی گئی ہے کہ اسلام سے وابستگی رکھنے والی اکثریت اور ان کی قیادت کرنے والے ملایان قہستانی کو تھوڑا سا بہلا کر آہستہ آہستہ کام کیا جائے۔ سمرقند و بخارا کا بھی ایک تجربہ تھا، اور اب مصر اور صومالیہ کا بھی ایک تجربہ سب کے سامنے ہے۔ دیکھیے کہ افغانستان کا تجربہ کیسا رہتا ہے۔

تضاد جہاں تیزی و طراری کا آئینہ دار ہوتا ہے، وہاں یہ کمزوری کا بھی مظہر ہے۔

اگر افغانستان کی مذہبی اکثریت کو مطمئن کرنا ہو تو کمیونزم کی خدمت نہ ہو سکے گی، اور اگر کمیونزم کی خدمت کی جائے تو اسلامی اکثریت کو مسلسل کچلنا ہوگا۔

لیکن نور محمد ترہ کی صاحب نے کل کی پریس کانفرنس میں یہ جو فرمایا کہ یہ حکومت کمیونزم کی نہیں ہے اور اسلامی بنیادوں پر ہی ریاست کو حسب سابق چلائے گی، روس کی خصوصی سرپرستی میں نہیں جائے گی۔ کسی وقت انتخابات کرائے جائیں گے اور اغلباً حکومت کی کمیونسٹ پارٹی کے علاوہ دوسری جماعتوں کو بھی کام کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ ان باتوں کے پیش نظر مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ ذرا صبر سے دیکھا جائے کہ کیا رنگ جاتا ہے اور کیا آتا ہے۔

۴۔ افغانستان میں کمیونسٹ عنصر آہستہ آہستہ پرورش پاتا رہا۔ اس کی آبیاری باہر سے بھی ہوتی ہوگی صدر داؤد نے برسر اقتدار آنے میں اس عنصر سے مدد لی۔ گویا اسے اور مستحکم کر دیا۔ اب معاملہ یہ تھا کہ یہ لوگ صدر داؤد سے قیمت بھی وصول کرنا چاہتے تھے۔ صدر داؤد نے اس سے گریز کیا۔ نتیجہ انقلاب!

اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ عنصر کسی بھی ملک میں رہ کر یہ خدمت انجام دیتا ہے کہ جب موقع ملے قوم کو بیرونی نظریات کے تسلط میں دے دے۔ یہ لوگ شکار کو گھیر گھار کر نشانے پر لانے والے ہیں۔ یہ غلام سازی کا ایک سلسلہ ہے۔

اگر ایسا ہے تو ہر مسلم ملک کو پہلے سے فکر کرنی چاہیے کہ یہ عنصر مضبوط نہ ہونے پائے، ساز باز نہ کر سکے۔

---

[1] دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ افغانستان میں براہ راست کمیونزم یا کمیونسٹ حکومت یا کسی کا کمیونسٹ کہلا کر مقبول عوام ہونا ممکن نہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اہم اداروں میں نفوذ نہ کر سکے، اہم عہدوں پر قابض نہ ہو۔

غفلت کی جائے گی تو یہ پوری قوم کو ہائی جیک کر کے کہیں کا کہیں پہنچا دے گا۔

۴۔ افغانستان کے حالات ایسے نہیں ہیں کہ وہاں کمیونزم اپنے خاص قسم کے شعبدے بہت زیادہ دکھا سکے۔ نہ وہاں کوئی خاص صنعتی نظام ہے کہ اُسے قومی ملکیت میں لے کر مزدوروں کو کچھ دیر کے لیے یہ خواب دکھایا جائے کہ لو اب سب کچھ تمہارا ہے۔ نہ زرعی نظام ہی کوئی خاص اہمیت رکھتا ہے، تھوڑی بہت زمینداری ہے، وہ انفرادی ملکیت کے تحت ہے، تھوڑی سی جاگیرداری بھی ہے۔ مگر اتنا بھی نہیں کہ کچھ دیر انقلابی بگولوں سے کھیتوں کی خاک اُڑائی جا سکے۔ افغانستان اپنا پیٹ بھرنے کے لیے غلہ تک تو پیدا نہیں کر سکتا، دوسری ضروریات تو رہیں الگ۔

پس وہاں کمیونزم کا کھیل دکھانے سے زیادہ اہم یہ ہے کہ رُوس کو توسیع پسندی کے معرکے کے لیے ایک اور "بنکر" مل جائے۔ سو وہ مل گیا ہے۔ روسی سفیر برائے پاکستان کے ارشادات کا لب و لہجہ دیکھ لیجیے جو انہوں نے افریشیا کو انٹرویو دیتے ہوئے فرمایا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے پاکستان کی نوآبادی کو احکام سنائے جا رہے ہیں۔ اصل ہدف گرم پانی کی بندرگاہ کا حصول ہے (یہ سطور چھپنے جا رہی تھیں کہ انٹرویو کی تردید آگئی)۔

۵۔ روس اور افغانستان کی سفارتی سرگرمیاں ہمارے یہاں کچھ بھی ہوں۔ مختلف لابیز کسی بھی طرح کام کریں، ہمیں کسی ہراس میں پڑ کر ایک ایسے اندیشے کو اپنے اُوپر خواہ مخواہ اوڑھ نہیں لینا چاہیے۔ ہمارے کرنے کے جو صحیح کام ہیں وہ ہمیں کرنے چاہییں، اور بے سوچے سمجھے کوئی غلط قدم نہیں اُٹھانا چاہیے۔ نہ تو رُوس کے خوف سے کوئی حرکت کی جائے، اور نہ رُوس سے اُلجھاؤ پیدا کرنے کا کوئی سبب مہیا کیا جائے۔

ٹھنڈی میانہ رو اسلامی پالیسی ہی میں ہمارا بچاؤ ہے۔

دُور رس نظر سے دیکھا جائے تو جس دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام ہے اس کے چڑھاؤ کا دَور گذر چکا ہے۔ اب جبکہ اندر بھی آویزش ہے اور باہر بھی کھینچا تانی۔ اس کا اتار ہو رہا ہے۔ اور اس اتار کو شاید تیز رفتار بنانے میں عالمِ اسلام کی تحریکاتِ اسلامی کی وہ مقناطیسی لہریں بھی کام کر دکھائیں گی جو چاروں طرف موجود ہیں۔ پاکستان کا محل وقوع ایسا ہے کہ یہاں کوئی خلل واقع ہوا تو پھر پوری دُنیا کے امن کا بحر الکاہل آپس ہی میں ٹکرانے والے کئی طوفان اُٹھا دے گا۔ پاکستان افغانستان کی طرح بند معاشرہ نہیں ہے۔

۶۔ اس انقلاب کے ساتھ مسئلہ پختونستان پھر سامنے آیا ہے۔ یہ ایک غیر متعین ہیولیٰ سا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

افغانستان کی مختلف حکومتیں اسے استعمال کر کے رخصت ہو گئیں اور ۱۰۳ سال گذر گئے۔

اچھا ہو کہ ایک بار اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں اس مسئلے پر کھلی بحث ہو اور پاک افغان سرحد کے دونوں طرف ریفرنڈم کرا کے دیکھا جائے کہ ہماری کتنی آبادی افغانستان میں جانا چاہتی ہے اور افغانستان سے کتنی تعداد ہمارے یہاں آنا چاہتی ہے اور دونوں کی تعداد وں کے مطابق کتنے کتنے مربع میل علاقے ادھر سے ادھر یا ادھر سے ادھر ملحق ہونے چاہییں۔

اتنا مبہم اور غیر متعین مسئلہ شاید کبھی وجود میں نہیں آیا۔ اور آیا ہو تو اتنی دیر زندہ نہیں رہا۔ جیسے یہ ایک غبارہ ہے کہ جب چاہا اس میں ہوا بھرلی۔ اور جب چاہا ہوا نکال کر غبارہ تہ کیا اور مال خانے میں رکھ دیا۔ کاش کہ اسلامی اخوت اتنی بھی اہم ہوتی جتنا پختونستان کا غبارہ ہے۔

۷۔ روسی سفیر نے دوستوں کے مسئلے پر کھل کر بات کی ہے۔ اس کا ترجمہ کیا جائے تو یہ ہے کہ ہم سے دوستی رکھنی ہے تو چین سے انقطاع کر لو، مصر اور سعودی عرب اور صومالیہ کو چھوڑ کر لیبیا اور ایتھوپیا سے تعلقات جوڑو، ایران اور ترکی سے کنارہ کر کے عراق اور شام سے ربط رکھو۔

مگر دوستیاں عرصۂ دراز کے تاریخی عمل سے عوام میں نشوونما پاتی ہیں۔ عوام میں جب کچھ ممالک اور اقوام کے لیے اُن کے رویّے کی وجہ سے محبت کے جذبات پیدا ہو جائیں تو کوئی حکومت رائے عام کے مزاج سے ٹکرانا پسند نہیں کرتی۔

کہتے ہیں کہ دوستی مساوی بنیادوں پہ ہوتی ہے۔ یہ اگر صحیح ہے تو روس بھی ہماری پسند و ناپسند کے مطابق تعلقات کا نقشہ کچھ نہ کچھ بدلے۔ کیا ایسا ممکن ہے؟ اگر نہیں تو ہر چہ بر خود نہ پسندی، بہ دیگراں مپسند۔ اصول کوئی ایک ہونا چاہیے۔ اور اس کا اطلاق یکساں۔ کوئی اگر چاہے کہ تمام دوستیاں ہماری مرضی کے مطابق ہونی چاہییں تو اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ دفتر خارجہ کا چارج ہمیں دے دو۔ پھر آخر دفتر داخلہ کو کیسے الگ رکھا جا سکے گا۔

۸۔ بنیادی طور پر ہمارے روس سے بھی دوستانہ تعلقات ہیں، اور افغانستان تو برادر پڑوسی ملک ہے۔ ہم اختلاف تو کر سکتے ہیں، کوئی عناد نہیں رکھتے۔ ہمارا کسی سے کوئی ٹکراؤ نہیں ہے۔ نئے حالات و واقعات کے رُونما ہونے پر اپنے اپنے رنگ کے تاثرات ہو سکتے ہیں۔ مگر یہ چیزیں دوستانہ سفارتی، تجارتی اور ثقافتی تعلقات کی نفی نہیں کرتیں۔ پھر کیا یہ کافی نہیں ہے؟

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(۳)

ایک صدمۂ جانکاہ کا سامنا کر کے دل تھام ہی رہے تھے کہ مزید ایک خبرِ غم اثر نے روح کے دروازے پر دستک دی۔ سارا قصرِ احساس لرز اٹھا[1]۔

ماہرالقادری ایڈیٹر فاران ہم سے جدا ہو گئے! ایک چمکتا ستارہ آسمانِ ایمان و ادب سے اور ٹوٹ گرا۔ خانۂ ظلمت میں گھی کے چراغ جلے ہوں تو کیا عجب!

سفر پر نکلنے سے پہلے دو ایک بار ٹیلی فون پر میرے بارے میں بالواسطہ طور سے معلوم کیا کہ آیا مجھے بھی چلنا ہے یا نہیں۔ میری طرف سے انہیں شاید میرا جواب مل گیا ہو کہ مجھے تو طلب ہی نہیں کیا گیا۔ دل میں سوچا کہ اپنی شعروشاعری بھی کیا، اور ہو بھی تو اپنے جذبہ و تخیل کے حباب مشاعروں کے تیز و تند طوفانوں میں کیا جگہ پائیں گے۔ وہاں تو صدفِ فن کے گوہر مقام پاتے ہیں، یا پھر چٹانوں اور پتھروں کو وزن ملتا ہے کیونکہ وہ گرم و سرد اور موافق و مخالف رووں سے بے نیاز جہاں کے تہاں جمے رہتے ہیں۔

دو ماہ پہلے انہیں انگلینڈ سے برمنگھم کی سیرت کانفرنس (۲۷ تا ۲۹ مئی ۱۹۷۸ء) کے لیے دعوت نامۂ شرکت ملا تھا۔ ماہر صاحب سفر اور سیر کا شوقِ فراواں رکھتے تھے۔ دعوت کو دل سے قبول کر کے وہ خوشی خوشی اپنے کام تیزی سے نمٹانے میں مصروف ہو گئے۔ ماہِ رواں کے علاوہ فاران کے مزید دو شماروں کے لیے مضامین جمع کر کے انہیں مرتب کر دیا۔ اسی دوران میں جدہ سے مشاعرہ کا دعوت نامہ ملا۔ خط میں لکھا کہ جدہ جا رہا ہوں، عمرہ و زیارات میں کچھ دن صرف کروں گا اور پھر اگر انگلستان سے ٹکٹ موصول ہو گیا تو آگے چلا جاؤں گا۔ مگر انہیں کسی اور ہی طرف آگے جانا تھا۔ وہ سمندر پار جانے کے بجائے حیاتِ ارضی کی سرحد کے اس پار چلے گئے۔ ادھر سے دعوت نامہ اور ٹکٹ پہلے آ گیا ع

جدہ گئے، پھر آگے بہ صحنِ حرم گئے — پھر اور آگے نکلے تو سوئے ارم گئے

---

[1] اشارات کے جملہ صفحات کتابت ہو کر پریس جا رہے تھے کہ ماہر صاحب کی اچانک وفات کی اطلاع موصول ہوئی۔ دل کے تاثر نے مجبور کیا اور فوری طور پر یہ چند سطور مرحوم کے متعلق لکھی گئیں۔ اشارات کا پورا نقشہ بدل دیا گیا ہے۔ (ن۔ص)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حلقۂ یاراں میں ماہر صاحب کی قدآور شخصیت کو بے حد مرکزی مقام حاصل تھا۔ وہ نہ صرف اوّل درجے کے شاعر تھے اور فن اور زبان و محاورہ کے راز دان، بلکہ مادہ پرستانہ دَور نے لامقصدی ادب اور بدن پرست ادب کے جو محاذ پیدا کر دیے تھے اُن کے خلاف جہاد آرا رہے۔ اس دَور کے مزاج میں ہر روایت میں اندھا دھند بغاوت، ماضی کے خلاف نفرت، اصولوں، ضابطوں اور قدروں کو توڑنے کے لیے ایک نفسیاتی ہیجانی کیفیت کی جو بدبلا پائی جاتی ہے، وہ ایک طرف دین و اخلاق کی بنیادوں کو متزلزل کرتی رہتی ہے۔ اور دوسری طرف تہذیبی اور لسانی معیاریت کو تباہ کرنے میں لگی رہتی ہے۔ ماہر صاحب بھی دوہرا کام کرتے رہے دین و اخلاق کے تحفظ کا جہاد بھی جاری رکھا، اور زبان کو بگاڑنے اور فن کو خراب کرنے کی مہمات کے خلاف بھی بڑی جرأت سے معرکہ آرا رہے۔ دراصل وہ ایک ہی کام تھا جسے وہ دو محاذوں سے انجام دے رہے تھے۔ اُن کی وجہ سے ہماری ادبی سرگرمیوں کا بڑا بھرم قائم تھا۔

دین کے تقاضوں سے حق کہنے میں بے باکی کی وہ ایک روشن مثال تھے۔ پاکستان میں کیسے کیسے مرد افگن دَور گزرے ہیں، مگر ماہر صاحب کا قلم غلام محمد اور سکندر مرزا کے دَور سے لے کر بھٹو صاحب کے زمانے تک سلطان جائر کے سامنے کلمۂ حق بڑی سلیس زبان میں کہتے چلے گئے اور بارہا حکومتوں کے اُٹھائے ہوئے انحرافی مباحث میں تحقیقی مضامین لکھے اور لکھوائے۔ کسی بڑے سے بڑے آدمی کی کوئی ایسی کتاب سامنے آئی جس میں دین کی کسی حقیقت کو مسخ کیا گیا ہو، یا بیجا طور پر حکومت کی خوشامد کے جذبے سے مسائل کو تاویل کے سانچے میں ڈھالا گیا ہو، یا فرقہ وارانہ نزاعات کی گھٹیا سطح پر کوئی نکتہ آرائی کی گئی ہو تو وہ ایک ایک پیرے ایک ایک فقرے اور ایک ایک لفظ کی چیر پھاڑ کر کے چھوٹے سے چھوٹے اجزائے فکر و بیان کو اس طرح نمایاں کر دیتے کہ جیسے کسی محدب شیشے کی مدد سے جراثیم اور وائرس کو بڑا کر کے دیکھا اور دکھایا جاتا ہے۔

ماہر صاحب محض ایک ادبی دانشور ہی نہ تھے، بلکہ وہ تحقیق و مطالعہ کے ساتھ اقامتِ نظامِ حق کے لیے پیش آمدہ مسائل پر مؤثر کلام کرتے تھے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اسلامی دستور، اسلامی قانون، اسلامی تہذیب، اسلامی تعلیم اور اسلامی حکومت کے لیے ملک میں جو تحریک اوائلِ قیامِ پاکستان سے چل رہی ہے اس میں ماہر صاحب کا بھرپور حصہ شامل ہے۔ یقیناً اُن کی یہ خدمت خدا کے ہاں وزن و قدر رکھتی ہے۔

ماہر صاحب جوانی میں صبح بنارس جیسی نظمیں لکھنے کے باوجود دل کے مسلمان تھے۔ اور نعت گوئی کی طرف طبعاً اُن کو رغبت تھی۔ ۱۹۵۴ء میں زیارتِ حرمین سے بہرہ مند ہوئے تو اُن کے اندر حمیتِ دین اور محبتِ رسولؐ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے جذبات کو خاص نشوونما ملی۔ اس سفر کی کیفیات کا اظہار انہوں نے "کاروانِ حجاز" میں کیا ہے۔ بعد میں یہ رنگ اُن کے ہاں روز بروز گہرا ہوتا گیا۔ اُن کے یہی مقدس جذبات اللہ تعالیٰ کے ہاں ایسے قبول ہوئے کہ بیماری کے کسی لمبے چکر میں پڑے بغیر اپنے قدموں سے چل کر جان جانِ آفرین کو سپرد کرنے کے لیے سرزمینِ حجاز میں پہنچے۔ مشاعرہ پڑھنے گئے تھے مگر وہاں ان کا جنازہ پڑھا گیا۔ جنازہ پڑھے جانے کا مقام بیت اللہ شریف تھا تو اس کا وقت نمازِ جمعہ کے بعد مقرر ہوا۔ تدفین مکہ کے قبرستان جنت المعلیٰ میں ہوئی۔ علامات صاف بتا رہی ہیں کہ اس شخص کو کیا مقام ملا۔

ہم اپنے نقصان کو دیکھ کر روتے ہیں، مگر جس کے ہاتھ میں زندگی و موت کا فیصلہ ہے، اس کی نگاہ خیرِ کل پہ ہے اور خیرِ کل ہی کے لیے اس کے کچھ قوانین اور سنن ہیں اور ہر جان کی اجل مسمّیٰ ہے۔ ہم اُس کے سامنے پورے ایمان و اعتماد کے ساتھ سرِ تسلیم خم کرتے ہیں اور اپنے لیے مقامِ صبر و رضا چاہتے ہیں۔

ماہر صاحب باغ و بہار شخصیت تھے، بذلہ سنج، لطیفہ گو، نکتہ طراز، اپنی خاص طرزِ ترنم کے موجد، مشاعروں کے بادشاہ، خندہ جبین، احباب نواز، وسیع الروابط، رونقِ مجالس، علم سے بہرہ مند، مطالعہ کے خوگر، شائستہ اطوار، خطوط کا جواب دینے میں نہایت باقاعدہ، لباس اور رہن سہن میں سادگی پسند، غرور سے خالی، بعض معاملات میں بچوں کی طرح بھولے بھالے، اپنی بے اولادی کے تذکرے سے انتہائی مجتنب، اہلیہ کی وفات کے بعد خدمتِ دین و شعر میں پہلے سے زیادہ سرگرم، مرحوم کی کیا کیا خوبیاں عجلت میں لکھے ہوئے اس مختصر نوٹ میں بیان ہوں۔

ذاتی طور پر مجھے ان کا خاص التفات حاصل رہا، اور میری کوتاہیوں اور غفلتوں کے باوجود اُن کی برادر نوازی میں فرق نہیں آیا۔

موجودہ شخصیتوں میں سے سب سے زیادہ محبت و احترام ان کے دل میں مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودُودی کے لیے تھا۔ پاکستان بننے سے پہلے ہی موصوف سے اثر پذیر ہوئے۔ جس زمانے میں وہ فلمی دائرے میں گیت لکھنے (۱۹۴۲ء) کے تجربے میں پڑے۔ اسی زمانے میں اس کام سے ان کے اندر الجھن پیدا ہوئی۔ مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودُودی سے خط و کتابت کی۔ اُن کے ایک خط کا یہ حصہ مجھے اب تک یاد ہے کہ انہوں نے لکھا تھا کہ مجھے اوسطاً دو ہزار روپے ماہانہ آمدنی ہو رہی ہے۔ اس خط کا جواب اغلباً مولانائے محترم نے میرے ہی ذریعے لکھوا کر بھجوایا تھا۔ اس خط و کتابت کے نتیجے میں فلمی کام چھوڑ دیا، بلکہ انہوں نے آگے بڑھ کر اسلامی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مقاصد کو فن کی روح بنانے کا آغاز کر دیا۔ نئے دورِ شاعری میں ان کی ایک عام فہم مگر حقیقت کا عکس پیش کرنے والی نظم قرآن کی فریاد بہت مقبول ہوئی۔ بعد میں اسلامی دستور پر لکھی ہوئی ایک نظم جگہ جگہ مجالس میں پڑھ کر سنائی جاتی رہی ہے۔

اپنی منزل، اپنا مقصد اسلامی دستور

اسی طرح جب سکندر مرزا کا مارشل لا لگا اور جماعت خلاف قانون قرار پائی تو پیرایۂ غزل میں انہوں نے مارشل لا کے آسیبی سائے میں مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کے ابتلا کو بڑی خوبی سے بیان کیا ؎

شکوۂ آسماں کرتے کرتے ❊ رک گیا ہوں فغاں کرتے کرتے
عمر گذری ہے بادِ صبا کی ❊ خدمتِ گلستاں کرتے کرتے
ہو نہ جاؤں بہاروں سے بھی بدگماں ❊ اعتبارِ خزاں کرتے کرتے

مولانا مودودی اور جماعت اسلامی پر سیاسی اور دینی دائروں سے جو حملے ہوتے رہے تھے، ان سب کا جواب دینے کے لیے قلم کو نیزے میں بدل لیتے۔ اور اس کی نوک سے مخالفانہ مواد کا ایسا ناقدانہ تجزیہ کرتے کہ لفظ لفظ بے جان ہو کے رہ جاتا۔ اسی کے ساتھ جب کوئی مقام ایسا ہوتا کہ مولانا کی کسی بات سے، خواہ وہ تفسیر اور فقہ سے متعلق ہو، یا زبان اور محاورے کے بارے میں، اختلاف ہوتا تو بے محابا اس کا اظہار کرتے، خط لکھتے، ملاقاتوں میں گفتگو کرتے، کبھی ان کے مخلصانہ دلائل سے مولانا متاثر ہو کر اپنی بات میں کوئی تبدیلی کر لیتے، اور کبھی ماہر صاحب کو قائل ہونا پڑتا۔ اور کبھی اختلاف اپنی جگہ برقرار رہتا۔ یعنی انتہائی محبت و احترام کے باوجود معاملہ اندھی عقیدت کا نہ تھا۔ مولانا مودودی نے ایسے ہی آدمی بنانے میں عمر کھپائی ہے۔ محبت کے باوجود اختلاف، اور اختلاف کے باوجود محبت و اتحاد۔

یہ شخصیت جس کی ولادت کیسر ضلع بلند شہر یو پی میں ۳۰ جولائی ۱۹۰۷ء (۱۳۲۴ھ) کو ہوئی اور جس کا تاریخی نام منظور حسین رکھا گیا، ۱۱ مئی ۱۹۷۸ء کو تین بجے شب ہم سے جدا ہو گئی، اگلے دن نماز جمعہ کے ساتھ حرم شریف میں جنازہ پڑھا گیا اور مکہ کے جنت المعلی نامی قبرستان میں تدفین ہوئی۔

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ!

رب غفور و ودود، ہمارے اس بزرگ و محبت رفیق کی روح کو اپنی خاص رحمتوں سے مالا مال کرے۔ آمین

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(اضافہ از ابوالاعلیٰ) ماہر صاحب مرحوم میرے قدیم ترین دوستوں میں سے تھے۔ تقریباً پچاس سال پہلے میری اور ان کی دوستی کی ابتدا ہوئی تھی جو آخر دم تک قائم رہی۔ مجھ سے ان کی مخلصانہ محبت کے گواہ فاران کے صفحات ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، اُن کی نیکیوں کو قبول اور لغزشوں کو معاف فرمائے، اور انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔

ایک تجویز

بھارت اور اس کے علاوہ بھی بعض ممالک میں ایک اسکیم "ڈرگ بنک" (یا دواؤں کا بنک) کے نام سے چلتی ہے۔ جس کا منشا یہ ہوتا ہے کہ شہروں میں تقریباً ہر گھر میں ٹیکے اور گولیاں اور دوسری ادویہ بچی پڑی رہتی ہیں۔ کبھی تو اس وجہ سے کہ ڈاکٹر علاج تبدیل کر دیتے ہیں اور کبھی اس سبب سے کہ پوری ادویہ کے استعمال سے پہلے ہی علاج مکمل ہو جاتا ہے۔

ان ادویہ کو جمع کر کے غریبوں کے علاج میں لگایا جا سکتا ہے۔

اب تک دوسرے ممالک میں یہ اسکیم حکومتی انتظام سے چلائی گئی ہے۔ مگر پاکستان میں اگر جماعت اسلامی کا شعبۂ خدمتِ خلق اس کام کو سنبھال لے تو اخبارات میں وقتاً فوقتاً اشتہار دے کر، ہینڈ بل تقسیم کر کے، جمعہ کے اجتماعات میں مساجد کے اندر اعلانات کر کے پبلک سے یہ اپیل کی جا سکتی ہے کہ جن اصحاب کے ہاں بچی بچائی سگ بند ادویات پڑی ہوں، وہ فلاں فلاں مراکز میں پہنچا دیں یا پوسٹ کارڈ لکھ کر اطلاع دیں تو ہمارے کارکن خود گھروں پر جا کر وصول کر لیں گے۔

جمع شدہ ادویات کا جائزہ کوالیفائیڈ ڈاکٹر (اور یونانی ادویہ ہوں تو مستند حکیم) کے ذریعے لیا جائے گا۔ اول یہ کہ آیا کوئی ٹیکہ یا دوا اپنی مقررہ میعاد ختم تو نہیں کر چکی۔ وہ اس حالت میں تو نہیں ہے کہ مشکوک ہو چکی ہو اور اس کے استعمال سے ضرر کا اندیشہ ہو یا فائدہ کی اُمید نہ ہو۔ پھر جن دواؤں کو ڈاکٹر یا حکیم صاحبان پاس کر دیں اُن کو گشتی اور قائم شفاخانوں میں موجود رکھا جائے اور اُن کی باقاعدہ فہرست تیار کر لی جائے۔ ایسے غربا جو دواؤں کی قیمت ادا نہ کر سکتے ہوں یا مہنگے ٹیکوں اور ٹیکوں کو بازار سے نہ خرید سکتے ہوں، ان کو ڈرگ بنک سے مفت دوائیں مہیا کی جائیں۔

(نعیم صدیقی)

© rasailojaraid.com